خلاصہ جات:اُردو لازمی سالِ اول

ترتیب و تالیف: کاشف بشیر کاشفؔ (ایم۔فل اُردو)

0333-6912300

سبق نمبر 6 : اوور کوٹ

(خلاصہ)

افسانہ "اوور کوٹ"۔۔۔ایک مختصر جائزہ

اوور کوٹ بیسویں صدی کے نصف اول میں برصغیر کی معاشرتی تصویر کے ساتھ ساتھ سماجی رسوم اور معاشی و معاشرتی تعصبات کی بھینٹ چڑھے نوجوانوں کی پکار بھی ہے۔ ایسا نوجوان جو انگریزی تہذیب سے مرعوب اور معاش و مفلسی کے ہاتھوں یرغمال ہے۔ یہ نوجوان جو اپنی اصلیت کو نئی انگریزی تہذیب کے اوور کوٹ میں چھپائے حقیقت سے لڑ رہا ہے۔ آدھ کھلا پھول نوجوان طبقہ کی اُن ادھوری خواہشات کا غماز ہے جو وقت کی شدت اور مفلسی کی سولی چڑھ جاتی ہیں۔ اوور کوٹ کا مرکز وہ نوجوان ہے جو لباس و پوشاک کے اعتبار سے انگریز سے مرعوب ہے اور بلاشبہ انگریز حکمران تعظیم و توقیر کے اعتبار سے اہل برصغیر کے لیے ایک متاثر کن طبقہ تھے۔اسی لیے نوجوان اپنی تہذیب کے برعکس عہد نو کے مطابق انگریزی لباس کو ترجیح دیتا ہے۔وہ بھید کی چھڑی سے حاکم کی مانند نظر آنا چاہتا ہے جو ہر طبقہ پر حکم چلانے کا حق رکھتا ہے اور چھڑی سے اقتدار کا لطف چاہتا ہے بلاشبہ چھڑی اس نوجوان کے غرور پسند اور اقتدار پسند ہونے کی علامت اور غماز ہے جو احساس کمتری کے دور میں کمتری کے احساس میں مبتلا ہر شخص کی آرزو ہوتی ہے۔ معاشرتی و تہذیبی علامتوں سے بھرپور اوور کوٹ معاشرہ پر ایک تنقید اور تشویش کی علامت ہے۔غلام عباس کا یہ تنقیدی رنگ اور تشویشی طرز لاجواب اور دل پذیر ہے۔خاص طور پر اختتامی جملہ بے شمار علامتوں کو جنم دینے کے علاوہ سوالات کی بوچھاڑ کرتا ہو قاری کو سماجی نظام اور تہذیب انحطاط کے ساتھ ساتھ دنیا کی بے ثباتی کی ایک لہر سے بھی آشنا کر جاتا ہے۔"افسوس کہ اس کی بید کی چھڑی جو حادثے کے دوران کہیں کھو گئی تھی اس فہرست میں شامل نہ تھی۔"

مصنف کا نام: غلام عباس آخذ: جاڑے کی چاندنی

اشارات

1۔نوجوان کا حلیہ
2۔چونچالی
3۔بچوں کا کھیل اور خوانچے والے سے گفتگو
4۔راہگیروں کا لباس
5۔ اوور کوٹ کی خصوصیات
6۔مختلف دکانوں پر نوجوان کا ردعمل
7۔حادثہ
8۔ہسپتال میں نوجوان کی حالت
9۔ نرسوں کا ردعمل
10۔نوجوان کا سامان

خلاصہ

جنوری کی ایک سرد شام کو ایک خوش پوش نوجوان ڈیوس روڈ سے گزر کر مال روڈ پر پہنچا۔ چیرنگ کراس کا رخ کر کے آہستہ آہستہ چلنے لگا۔اپنی تراش خراش سے وہ فیشن ایبل معلوم ہوتا تھا۔اُس نے بادامی رنگ کا اوور کوٹ پہن رکھا تھا اور گلے کے گرد گلوبند لپیٹ رکھا تھا۔ سر پر سبز فلیٹ ہیٹ اور ہاتھ میں بید کی چھڑی پکڑے وہ بڑی شانِ بے نیازی کے ساتھ چلتا جا رہا تھا۔یہ ہفتے کی شام تھی۔ سردی کا موسم تھا۔لوگ سردی کا اثر کم کرنے کے لیے

تیز چل رہے تھے مگر وہ نوجوان بڑے مزے سے ٹہل رہا تھا۔ تانگے یا ٹیکسی والا اُس کی طرف بڑھتا تو وہ نخوت سے "نو تھینک یو" کہہ کر اسے ٹال دیتا۔ مال کے زیادہ بارونق حصے کے قریب پہنچ کر اس کی چونچالی میں بڑھ گئی۔ جوش میں اس نے سیٹی بجانا شروع کر دی اور گیند کروانے کی جھوٹ موٹ کوشش کی جیسے کرکٹ میچ ہو رہا ہو۔ لارنس گارڈن کی اداسی اور اندھیرا دیکھ کر اس نے باغ میں جانے کی بجائے چیرنگ کراس کا رخ کیا۔ نوجوان نے رومال سے اپنے چہرے سے گرد صاف کی اور گھاس کے ایک ٹکڑے پر کھیلتے بچوں کو دیکھنے لگا۔ بچے اسے گھورتا دیکھ کر وہاں سے چلے گئے تو نوجوان سیمنٹ کے ایک خالی بینچ پر بیٹھ گیا۔ مال روڈ کی دکانوں پر لوگوں کا رش تھا۔ دکانوں کے باہر قوت خرید نہ رکھنے والے لوگ باہر سے جی بہلا رہے تھے۔ نوجوان سامنے سے گزرنے والے مرد وزن کو غور سے دیکھتا۔ اس کی نظر چہروں سے زیادہ ان کے لباس پر پڑتی تھی۔ زیادہ تر لوگ اوور کوٹ پہنے ہوئے تھے۔ نوجوان کا اپنا اور کوٹ تھا تو خاصا پرانا مگر اس کا کپڑا خوب بڑھیا تھا۔ وہ کسی ماہر درزی کا سلا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ نوجوان نے پان بیڑی والے کو آواز دی اور اکنی کا سگریٹ خرید کر مزے سے کش لگانے لگا۔ اُس نے بینچ کے نیچے بیٹھی ایک بلی کو "پور لٹل سول" کہتے ہوئے پیار کیا۔ سات بج چکے تھے۔ وہ پھر مال کی پٹری پر مٹر گشت کرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ ایک ریستوران کے باہر ہر قماش کے لوگ گانا سننے کے لیے کھڑے تھے۔ یہاں نوجوان پل بھر کے لیے رکا اور پھر آگے بڑھ گیا۔ راستے میں وہ ایک بک سٹال پر رکا۔ رسالوں کی ورق گردانی کی اور انھیں سلیقے سے رکھ کر آگے بڑھ گیا۔ پھر وہ ایک قالینوں کی دکان میں داخل ہو گیا۔ ایک ایرانی قالین کی قیمت پوچھی اور پھر مٹر گشت شروع کر دی۔ اوور کوٹ میں ٹکایا ہوا گلاب کا پھول باہر نکل آیا تھا مگر نوجوان کے چہرے پر تکان یا اکتاہٹ کے کوئی آثار نہیں تھے۔ راہگیروں کی ٹولیاں منتشر ہو رہی تھیں۔۔ اس دوران اس کی چھڑی گری جسے اُس نے "اوہ سوری" کہتے ہوئے اٹھایا اور آگے بڑھ گیا۔ شام سے اب تک مٹر گشت کے دوران میں جتنی انسانی شکلیں اس نے دیکھی تھیں، کوئی بھی اسے اپنی طرف متوجہ نہ کر سکی۔ نجانے وہ اپنے حال میں مست تھا یا کسی میں بھی کوئی جاذبیت ہی نہ تھی۔ سڑک پار کرتے ہوئے ابھی اس نے آدھی سڑک پار کی تھی کہ اینٹوں سے بھری ہوئی لاری نے اسے کچل ڈالا۔ لاری والا بوکھلا کر میکلوڈ روڈ کی طرف نکل گیا۔ لوگ جمع ہو گئے۔ ٹریفک کا ایک انسپکٹر بھی آ گیا۔ اسے ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ اسٹنٹ سرجن مسٹر خان اور دو نرسیں شہناز اور مس گل ڈیوٹی پر تھیں۔ نوجوان کا اوور کوٹ اس کے جسم پر تھا۔ سفید سلک کا مفلر گلے میں اور ہیٹ کسی نے اس کے سینے پر رکھ دی تھی۔ نوجوان کی ٹانگیں بری طرح کچل گئی تھیں۔ کپڑوں پر خون کے دھبے تھے۔ نرسوں نے اندازے سے کہا کہ کسی کھاتے پیتے گھرانے کا فرد ہے۔ جراحی کے لیے جب نوجوان کے کپڑے اُتارے گئے تو نرسیں حیران رہ گئیں۔ نوجوان کے گلوبند کے نیچے نکٹائی اور کالر تو کیا، سرے سے قمیص ہی نہ تھی۔ اوور کوٹ اُتارا گیا تو نیچے سے ایک بوسیدہ اور پھٹا ہوا اونی سویٹر نکلا۔ پھر ایک میلا کچیلا بوسیدہ بنیان نظر آیا۔ جسم پر میل کی تہیں چڑھی ہوئی تھیں۔ ایسا لگتا تھا وہ کہ وہ دو ماہ سے نہیں نہایا۔ پتلون کو پیٹی کی بجائے ایک پرانی دھجی سے باندھا گیا تھا۔ بٹن اور بکسوئے غائب تھے۔ گھٹنوں پر سے کپڑا مسک گیا تھا۔ بوٹ اُتارے گئے تو دونوں پاؤں میں مختلف رنگوں کی پھٹی ہوئی جرابیں تھیں۔ نوجوان دم توڑ چکا تھا۔ اس کا چہرہ چھت کی طرف تھا پھر دیوار کی طرف مڑ گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جسم اور اس کے ساتھ روح کی برہنگی نے اُسے شرمندہ کر دیا تھا۔ اُس کے اوور کوٹ کی جیب سے ایک چھوٹا سا کنگا، ایک رومال، ساڑھے چھ آنے، آدھا سگریٹ، چھوٹی سی ڈائری، نئے گراموفون ریکارڈوں کی فہرست اور کچھ اشتہار، جو مٹر گشت کے دوران میں لوگوں نے دیے تھے، بر آمد ہوئے۔ افسوس! اس کی بید کی چھڑی کہیں کھو گئی تھی۔